منصور احمد منصورؔ

اردو افسانے کے اساطیری آب و رنگ

اساطیر بھی بیانیہ کی ایک قسم ہے۔ یہ اگلے وقتوں اور قوموں کی وہ کہانیاں ہیں جو جادو، اسرار، تحیر اور مافوق الفطرت عناصر کے امتزاج و آمیزش سے مملو اور اپنے زمانے میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے اسباب و عوامل کی توجیح کرتی ہیں۔ ان کے توسط سے معاشرے اور ثقافت کی صورت و نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساطیر ہر دور میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی ترجمان اور آئینہ دار رہی ہیں۔ اساطیر کا تعلق اگرچہ ماضی سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہ صرف انسان کے حال میں کروٹیں بدلتی نظر آتی ہیں بلکہ انسان کے فکری، جذباتی اور ثقافتی رویوں کی تفہیم میں ممد و معاون ثابت ہو کر نئی معنویتوں اور جہتوں سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ عصر حاضر کے سائنسی اور تکنیکی دور میں بھی انسانی زندگی، سماج اور معاشرے میں اساطیر کا عمل دخل نہ صرف قائم ہے بلکہ نئی اساطیر جنم لے رہی ہیں۔ اساطیر کا مطلب ہرگز بت پرستی یا فوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی نہیں بلکہ یہ حیات و کائنات کی گتھی سلجھانے کی ایک ذہنی روش اور رویہ ہے۔ اساطیر کے اندر انسان کے آباء و اجداد کے احساسات و جذبات اور خیالات ہی مجسم صورت میں دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے توسط سے زندگی کے کتنے ہی اسرار و رموز آئینہ ہو جاتے ہیں۔ انسانی تہذیب و ثقافت پر سے کتنی

ہی پرتیں اٹھ جاتی ہیں اور کئی طرح کے دلچسپ نتائج اخذ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اساطیر کا تعلق انسان کے عقائد سے ہوتا ہے جس کے کردار تاریخی و نیم تاریخی اور مذہبی و نیم مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بلند ہمتی، ثابت قدمی اور غیر معمولی پن کی وجہ سے ماورائیت میں ملفوف ہو جاتے ہیں۔

اساطیر اور ادب کا تعلق بہت پرانا ہے۔ اساطیر نے ہمیشہ ادب کو نئے ابعاد اور نئے آب و رنگ عطا کیے۔ اردو افسانے کے افق پر بھی اساطیر کے رنگوں کی قوس قزح نظر آتی ہے۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ قصہ کہانی کی تمام صورتوں میں اساطیری اثرات کی بھرپور جھلکیاں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ اردو فکشن پر بھی مختلف قوموں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والی اساطیر نے مختلف انداز میں اثرات مرتسم کئے ہیں۔ چنانچہ اردو فکشن (داستان، ناول، افسانہ) میں ہندی اساطیر کا عمل دخل بھی دکھائی دیتا ہے اور قدیم عجمی، اسلامی اور یونانی اساطیر کی کارفرمائی بھی واضح دکھائی دیتی ہے۔ اردو فکشن میں اساطیری کرداروں اور اساطیری علائم کے استعمال نے واقعہ اور تجربہ کی معنویت کو گہرا کر دیا ہے۔ یہاں اردو افسانے میں اساطیر کے برتاؤ اور اس کے اثرات کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اردو افسانے نے ابتداء ہی سے اساطیر کے ساتھ تخلیقی رشتہ قائم کیا۔ اردو کے اولین افسانہ نگاروں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور راشد الخیری کے ہاں افسانے کی بنت میں ہندی، اسلامی و یونانی اساطیر کی چھاپ واضح طور پر دکھائی پڑتی ہے۔ راشد الخیری کے افسانوں ''کلونتیاں'' اور ''خیالستان کی پری'' سجاد حیدر یلدرم کے ''خارستان وگلستان'' اور ''حضرت دل کی سوانح عمری''، پریم چند کے ''رانی سارندھا''، ''نئی بیوی'' اور ''مرہم'' میں اساطیر کی شمولیت کا عمل واضح طور پر ملتا ہے۔ سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری کے رومانی افسانوں میں بھی اساطیری کردار و علائم ایک مخصوص فضا کی تشکیل کرتے ہوئے اساطیری ابعاد پیدا کرتے ہیں۔ اردو افسانے کے ابتدائی اور تشکیلی دور سے ہی اساطیر کے

ساتھ تخلیقی تعلق کے محرکات کو سمجھنے کے لیے ابن فرید کے مضمون ''دیو مالا اور علامت'' کے درج ذیل اقتباس کا حوالہ بے جا نہیں ہوگا:

''دیو مالا کے مطالعہ سے بنیادی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمام اساطیر بیانیہ ہوتی ہیں..... دیو مالا کے کردار بالعموم حقیقی ہوتے ہیں لیکن ان سے جذباتی لگاؤ انہیں رفتہ رفتہ مافوق الفطرت اور آخرکار الوہی بنا دیتا ہے۔ انہی بنیادی کرداروں کے گرد تخلیقی اور وضعی ہستیوں کا ایک حلقہ تیار ہو جاتا ہے جن کی اپنی کوئی حیثیت انفرادی طور پر نہیں ہوتی بلکہ وہ مرکزی ہستی کی کسی صفت یا اس قوم یا تہذیب کی کسی خواہش یا تمنا کا استعاراتی مظہر ہوتی ہیں۔ استعارہ کی تفصیل ایک مکمل تصویر کی شکل اختیار کر لیتی ہے جسے ہم تمثیل کہتے ہیں۔ ان تمثیلوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو مربوط ہو کر دیو مالا بن جاتے ہیں یعنی دیو مالائی تفاصیل من و عن ویسی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ جذباتی و تاثراتی تجربات کا استعاراتی اظہار ہوتی ہیں'' [1]

اساطیر کے بنیادی عناصر بیانیہ' تحیر' تخیل' جذباتی وابستگی اور قومی مذہبی جذبے کا استعاراتی اظہار' نے ہی افسانے کو اساطیر کی حدود میں داخل ہونے اور اس کے اندر جھانکنے کی ترغیب دی۔ اساطیر کے ساتھ تخلیقی رشتہ قائم کرنے میں تقسیم ملک اور اس سے پیدا شدہ المیہ بھی ایک اہم محرک ثابت ہوا۔ تقسیم کے نتیجے میں فسادات' خون ریزی' ہجرت' تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے ٹوٹنے بکھرنے سے جو سنگین صورت حال پیدا ہوئی' اس سے ذہنی و فکری رویے بھی یکسر بدل گئے۔ زمین' ثقافت' عقیدے' نظریے' ہجرت اور ان کے متعلقات شعر و ادب کا اہم موضوع بننے لگے۔ اپنی ثقافتی جڑوں کی تلاش اور اپنے ماضی

---

[1] چہرہ پس چہرہ ابن فرید ص ۲۴

اور روایات کے ساتھ تعلق کی دریافت تخلیقی سطح پر اساطیر کی تلاش پر منتج ہوا۔ ''ہجرت'' کو اس عہد کا نمایاں تجربہ بتاتے ہوئے انتظار حسین اپنے ایک مضمون'' ہمارے عہد کا ادب'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہجرت کے تجربے کے ساتھ ماضی کی قسمت خوب جاگی ورنہ اسے تو تقسیم ملک سے پہلے لکھنے والے ایک فالتو چیز سمجھ کر رد کر چکے تھے'' [1]

ماضی کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلق نے ہی ثقافتی جڑوں کی تلاش، معاشرے کے بجائے فرد کو مرکز توجہ بنانے اور ذات کے نہاں خانوں میں جھانکنے کے عمل کو تیز تر کر دیا اور شعر و ادب پر گہرے اثرات مرتب کر دیئے۔ انتظار حسین ان اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''......ادب پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ناپسندیدہ چیزیں پسندیدہ بن گئیں اور نامقبول رجحانات مقبول بن گئے۔ مذہبی عقیدہ، بادشاہوں کی تاریخ، دیو مالا، جن و پری کی کہانیاں اور توہمات جن کے حوالے پچھلے زمانے میں ادیبوں کو عیب کی بات نظر آتے تھے، عیب کی بات نہیں رہے......
> دیو مالا، مذہبی صحائف اور پرانی کہانیوں کے حوالے سے نظمیں اور افسانے لکھے جانے لگے'' [2]

افسانوی ادب میں دیو مالائی اور اساطیری رجحانات و اثرات در آنے کا دوسرا سبب وہ نظریۂ ادب تھا جو ترقی پسند تحریک نے پیش کیا۔ اس نظریہ کے تحت ادب زندگی کا آئینہ دار اور ترجمان قرار پایا۔ زندگی کی آئینہ داری کا مطلب یہ تھا کہ گرد و پیش کے حالات و

---

[1] علامتوں کا زوال، انتظار حسین ص ۱۰۳
[2] علامتوں کا زوال، انتظار حسین ص ۱۰۳

واقعات کو کیمرے کی آنکھ سے دکھایا جائے۔ترقی پسندوں کا سروکار خارجی زندگی کو سنوارنا تھا۔انہیں یہ زعم تھا کہ خارجی ماحول کے بدلنے سے انسان کے تمام دکھ درد اور آلام کا مداوا ہوگا۔اس کے ''باطن'' کے اندر بھی کوئی کرب، خلش اور اضطراب موجود نہیں رہے گا۔لیکن وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ شعروادب میں خارجی رشتوں کی توجیہہ سے زیادہ باطن کی دنیا کی تفسیر ہونے لگی۔باطن کی طرف مراجعت سے دیو مالا اور اساطیر کی تلاش کا عمل شروع ہوا اور پھر اجتماعی شعور اور آرکی ٹائپس کی دریافت اور اہمیت نے بھی اس عمل کو جلا بخشی۔چنانچہ ۶۰ء کی دہائی کے آخر میں افسانہ نگاروں نے اساطیر سازی کی طرف زیادہ واضح انداز میں توجہ دی۔انہوں نے نہ صرف اساطیر سے افسانے کی بنت میں مدد لی بلکہ آسمانی صحائف، مقدس شخصیات سے تعلق رکھنے والے تاریخی و نیم تاریخی واقعات اور مذہبی کرداروں، تلمیحات، استعارات اور صوفیاء کے ملفوظات سے رشتہ قائم کرتے ہوئے نئی اساطیر کی تشکیل بھی کی۔لیکن جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ اردو افسانہ اور اساطیر کا رشتہ شروع سے ہی قائم نظر آتا ہے اور اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں کے ہاں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔بعد میں بیدی، کرشن چندر، منٹو، ممتاز شیریں اور عزیز احمد کے افسانوں میں اساطیری روایات بھرپور انداز میں جھلکتی نظر آنے لگیں۔

بیدی کے بیشتر افسانے اساطیری آب ورنگ سے مملو ہیں۔عصر حاضر کی ناہمواریوں اور انسانوں کی خارجی و داخلی سطح پر شکست وریخت کو نمایاں کرنے کے لیے انہوں نے قدیم اساطیر سے فائدہ اٹھایا۔''متھن''، ''گرہن'' اور ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں انہوں نے ہندو دیو مالا کی مدد سے انسانی المیہ کو متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔ممتاز شیریں اور گوپی چند نارنگ نے اساطیری تناظرات میں مذکورہ افسانوں کے تجزیے پیش کیے ہیں۔گوپی چند نارنگ ''بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں'' میں لکھتے ہیں:

''وہ کہانی جس میں بیدی نے استعاراتی انداز کو پہلی بار پوری طرح استعمال کیا ہے اور اساطیری فضا کو ابھار کر پلاٹ

کو اس کے ساتھ ساتھ تعمیر کیا ہے، ''گرہن'' ہے۔ اس میں ایک گرہن تو چاند کا ہے اور دوسرا اس زمینی چاند کا جسے عرف عام میں عورت کہتے ہیں اور جسے مرد اپنی خودغرضی اور ہوسناکی کی وجہ سے ہمیشہ گہنانے کے درپے رہتا ہے.... اور اس طرح یہ چاند ایک گرہن سے نکل کر دوسرے گرہن تک مسلسل عذاب کا شکار ہوتا ہے'' [1]

''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ''لاجونتی'' اور ''متھن'' جیسے افسانوں میں بھی جو تہہ داری ملتی ہے، واقعاتی اور آفاقی پہلو ملتے ہیں وہ اساطیری فضا کی کوکھ سے ہی پھوٹتے ہیں اور افسانے بیانیہ کی سطح سے بلند ہو کر رمز و کنایہ اور استعارہ کی سطحوں کو چھو کر انسانی مقدرات کو گرفت میں لیتے ہیں۔ بیدی کے یہاں ''ببل''، ''لمبی لڑکی''، ''زمین سے پرے'' اور ''یوکلپٹس'' جیسے افسانوں میں بھی اساطیری رنگ پایا جاتا ہے۔

کرشن چندر کو ایک رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی تاہم ان کے ہاں بھی ایسے کئی افسانے ملتے ہیں جو علامتی، تمثیلی اور اساطیری رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔ ان میں ''کھٹے میٹھے انار''، ''کالا سورج''، ''گرجن کی ایک شام''، ''غالیچہ'' اور ''ہوا کے بیٹے'' قابل ذکر ہیں۔ ''گرجن کی ایک شام'' میں قصہ اساطیری دھندلکوں میں ابھرتا، پھیلتا اور بڑھتا ہے۔ سارا قصہ اگرچہ عشق و محبت کا ہے لیکن اسے اساطیری رنگوں میں لپٹا کر پیش کیا ہے۔ انہی رنگوں میں سے ایک رنگ ملاحظہ کیجئے:

''یہاں بجلیاں کوندتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، رم جھم رم جھم بارش ہوتی ہے، اولے پڑتے ہیں، برف گرتی ہے، پھر ہوا کے تیز و تند جھونکے آتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ آسمان خوشنما،

---

[1] اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل مرتبہ گوپی چند نارنگ ص ۴۷

نیلگوں، آفتاب سونے کے تھال کی طرح درخشاں اور پر
پھیلائے ہوئے ہوا میں تیرتی ہوئی چیل کسی پری کی طرح حسین
نظر آتی ہے''۔[1]

کرشن چندر کے رومانی اسلوب اور جمالیاتی رویے نے اس کہانی میں اساطیری فضا کو بھرپور انداز میں ابھارا ہے___

''ہاں ذی شی، میری ذی شی بہت اچھی لڑکی ہے۔ گرجن دیوتا
اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ سب برفیلے راستوں سے
واقف ہے۔ اسے گرجن دیوتا کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔
چھوٹی عمر میں ہی اس کی ماں مرگئی تھی، گرجن دیوتا ہی نے پالا
ہے''[2]

اسطوری عناصر کی آمیزش سے ''گرجن کی ایک شام'' میں فطرت کی پراسراریت مزید گہری اور تحیر خیز ہوجاتی ہے۔ ''ہوا کے بیٹے'' میں کرشن چندر افسانے کی ابتداء میں ہی ایک حیرت انگیز اور پراسرار سماں باندھتے ہیں۔ غار کے اندر ملگجا اندھیرے اور پراسرار ماحول سے تحیر کی جو فضا بنتی ہے، وہ اس وقت مزید گہری ہوجاتی ہے جب مختلف سمتوں سے آنے والی ہوائیں Personify ہوجاتی ہیں اور کہانی کا راوی جو طوفان میں گھر جانے کے سبب اس غار کے سامنے پہنچتا ہے تو جھکڑ کی ماں اسے بھی غار میں لے جاتی ہے جہاں وہ اس کے بیٹوں شمالی جھکڑ، جنوبی جھکڑ، مغربی جھکڑ اور مشرقی جھکڑ کو زخمی حالت میں پاتا ہے۔ کہانی کا موضوع انسان کے بنائے ہوئے تباہ کن ہتھیاروں کے خلاف شدید احتجاج ہے اور اسے اساطیری رنگ میں پیش کرنے کی کوشش ہے لیکن کرشن چندر کا شاعرانہ اسلوب

---

[1] گرجن کی ایک شام   مشمولہ کرشن چندر کے بہترین افسانے   مرتبہ اطہر پرویز

[2] اردو افسانہ۔ روایت و مسائل   مرتبہ گوپی چند نارنگ   ص ۴۷

اور مقصدیت حاوی ہوکر اساطیر کو کہانی کی بنت میں پوری طرح جذب ہونے سے روکتا ہے۔ وارث علوی اس افسانے کو''بچوں کی کہانی'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہوا کے بیٹے میں اساطیر کا استعمال ہوا ہے۔ مختلف سمتوں سے آنے والی ہواؤں کی طبعی خصوصیات کا بیان Personified طریقے پر ہوا ہے......افسانے کا پورا آرٹ خود آگاہ ہے اور کرشن چندر سامنے کی باتوں کو زور بیان سے آرٹ میں بدلنا چاہتے ہیں اور نہیں بدل پاتے'' [1]

ممتاز شیریں کے افسانے ''میگھ ملہار''، ''دیپک راگ'' اور ''آئینہ'' اسطور سازی کے عمدہ نمونے ہیں۔ ممتاز شیریں نے ان افسانوں میں ہندوستانی اور یونانی دیومالا کی مدد سے عصری زندگی اور معاصر سچائیوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ گرفت میں لیا ہے۔ ''میگھ ملہار'' میں اساطیر کے استعمال کے جواز کے بارے میں ممتاز شیریں خود لکھتی ہیں:

''دیپک راگ میں جہاں ٹھیٹ حقیقت نگاری ہے۔ اصل ماری زمینی حقیقت وہاں میگھ ملہار میں حقیقت آفاقی اور ماورائی ہے جو اساطیر کے ذریعے بیان ہوتی ہے'' [2]

ممتاز شیریں نے دیپک راگ اور میگھ ملہار میں اساطیر کو عصری زندگی سے منطبق کر کے عصریت، تاریخیت اور افسانویت میں ایک خوبصورت آہنگ پیدا کیا ہے ابن فرید ان افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان دو افسانوں میں بھی اساطیر کو نئے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نہ صرف اساطیری کرداروں کے ساتھ تخیل و

---

[1] اردو افسانہ۔ روایت و مسائل مرتبہ گوپی چند نارنگ ص ۳۲۵

[2] میگھ ملہار پر تبصرہ ممتاز شیریں نیا دور شمارہ ۳۱، ۳۲ ص ۲۳

تصور کی دنیا میں پرواز کرتی ہیں بلکہ زبان ولہجہ میں بھی وہ

Archaicانداز اختیار کرتی ہیں ـــــ اس طرح پوری

داستان میں نغمگی اور شعریت رچ بس جاتی ہے۔ میگھ ملہار

کے ذریعہ بنیادی طور پر افسانہ نگار نے اپنے اس نقطہ نظر کو عام

کرنا چاہتی ہے کہ فنکار اپنے فن کے اثر سے واقعی روح کی

گہرائیوں میں اتر سکتا ہے'' [1]

عزیز احمد نے ناول نگاری کی روایت میں توسیع کرنے کے ساتھ ساتھ انتہائی اہم اور سنجیدہ موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ انہیں ناول نگار، نقاد اور دانشور ادیب کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی لیکن اردو افسانے میں بھی انہوں نے نئے گل بوٹے کھلائے۔ اساطیر سے تخلیقی رشتہ کے اعتبار سے ان کے افسانے مدن سینا اور صدیاں، تیری دلبری کا بھرم اور زریں تاج قابل ذکر ہیں۔ افسانے میں اساطیری روایات کا بھرپور اور فنکارانہ استعمال قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے جس انداز سے کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔ انہوں نے قدیم اساطیر، حکایات اور ملفوظات سے ایسے لعل جواہر چن کر افسانے میں پرو لیے جن سے انسانی شعور لاشعور بھی منور ہو جاتا ہے۔ محمود ہاشمی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے فکر وفن پر اساطیر کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ کے خلاقانہ شعور کے ساتھ اپنی تہذیبی جڑوں کا سراغ

قصص واساطیری روایات وضمیات، عقائد وتوہمات کے وسیلے

سے ان دو افسانہ نگاروں کے یہاں جس طرح ہوتا ہے ویسا ان

سے قبل نہ ہو سکا تھا'' [2]

قرۃ العین حیدر کے یہاں قصص واساطیر کے توسط سے انسانی صورت حال

---

[1] اردو افسانہ روایت ومسائل ص ۴۵۱

[2] نذیر احمد۔ انتظار حسین کے افسانے۔ ایک مطالعہ مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان مرتبہ ارتضیٰ کریم ص ۵۹۱

سمجھنے کی کوشش ''روشنی کی رفتار''، '' آئینہ فروش شہر کوراں'' ''ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی'' اور ''سیتا ہرن'' میں ملتی ہے۔ سیتا ہرن ہندو اساطیر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جو تاریخیت اور عصریت اور حقیقت و ماورائیت کی خلا کو پاٹتے ہوئے انسان کی ازلی محرومیوں اور کرب کو ابھارتا ہے'' روشنی کی رفتار'' وقت اور تاریخ کی جبریت کی دھوپ چھاؤں میں انسان کی لاچارگی کو پیش کرتا ہے۔ پدما جب راکٹ کے ذریعہ وقت کے صدیوں پر پھیلے سلسلوں کو آن واحد میں طے کرتے ہوئے قدیم سرزمین مصر پر قدم رکھتی ہے تو عبرانی اپنی بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

> ''ہمیں بھی اپنے ساتھ اپنے وقت میں لے چلو''__ عبرانیوں نے اس سے التجا کی__ ''نہیں''__ پدما نے دل کڑا کر کے جواب دیا۔ یہ ممکن نہیں۔ ہم اپنے اپنے وقت سے آگے یا پیچھے نہیں جا سکتے۔ اپنے اپنے دور کی آزمائش سہنا ہمارا مقدر ہے۔ ہم تاریخ کو آگے یا پیچھے نہیں سرکا سکتے''[1]

انتظار حسین کے ابتدائی افسانوں سے ہی قدیم قصص، اساطیر اور دیو مالا سے تخلیقی تعلق قائم کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ چنانچہ 'قیوما کی دکان' کی افسانہ نگاری کا آغاز کرنے والے انتظار حسین سادہ بیانیہ نگاری سے منہ موڑ کر اساطیر، لوک کتھاؤں، جاتک، قدیم رمزی داستانوں، ملفوظات اور آسمانی صحائف کی طرف جست لگاتے ہیں__

> ''انتظار حسین کے شروع کے افسانے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے '' آخری آدمی'' میں ایک بہت بڑی تخلیقی چھلانگ لگائی ہے''[2]

---

[1] روشنی کی رفتار (مجموعہ روشنی کی رفتار) قرۃ العین حیدر ص ۲۱۵

[2] نذیر احمد۔ انتظار حسین کے افسانے۔ ایک مطالعہ مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان مرتبہ ارتضیٰ کریم ص ۵۹۱

انتظار حسین کے یہاں افسانوی طرز اظہار میں یہ تبدیلی اچانک رونما نہیں ہوئی بلکہ ''آخری آدمی'' کے افسانوی مجموعے کی اشاعت سے قبل بھی ان کے کئی افسانوں ''دلدل''، ''علم'' اور ''صلیب'' میں مذہبی علائم، کردار اور روا قعات ایک مخصوص مذہبی طرز احساس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ''آخری آدمی'' اور ''کچھوے'' میں انتظار حسین کا تخلیقی شعور ہندی و اسلامی اساطیر کی تشکیل نو کی صورت میں نظر آتا ہے۔ انتظار حسین کے فکر و فن کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ انسانی رشتوں کی نوعیت، صورت اور مائیت کو خارج سے زیادہ باطن میں تلاش کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی گہرا ادراک ہے کہ انسان اپنے ماضی سے کٹ کر ذات کی اکائی اور سالمیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا اور لمحہ موجود کی کسی تصویر اور نقش کی اس وقت تک تکمیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ ماضی کے ساتھ مربوط ہو۔ چنانچہ تہذیبی شخصیت اور ثقافتی تشخص کی تلاش اور بازیافت میں وہ گمشدہ معاشروں، نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے شہروں گلی کوچوں، امام باڑوں، روایتوں، عقائد، توہمات اور ان سرچشموں کو یاد کرتے ہیں جن سے ایک قوم کی شخصیت، مزاج اور کردار تشکیل پاتا ہے۔ اپنے افسانوی مجموعے ''کچھوے'' کے آخر میں انہوں نے ایک مضمون ''نئے افسانہ نگار کے نام'' شامل کیا ہے اس میں انتظار حسین نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے اس سے ان کے فکر و فن کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

> ''میں تو ماقبل زمانوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں..... زمینوں اور زمانوں میں آوارہ پھرتا ہوں۔ کتنے دنوں اجودھیا اور کربلا کے بیچ مارا مارا پھرتا رہا یہ جاننے کے لیے کہ جب بھلے آدمی بستی چھوڑتے ہیں تو ان پر کیا بیتتی ہے اور خود بستی پر کیا بیتتی ہے۔ اس طرح آوارہ پھرتے پھراتے میں مہاتما بدھ کی جاتکوں میں جانکلا اور ششدر رہ گیا کہ یا مولیٰ یہ کونسی دنیائے واردات ہے

جہاں آدمی ان گنت زمانوں اور ان گنت قالبوں میں زندہ و

تابندہ ہے.....''[1]

''آخری آدمی''، ''شہرِ افسوس'' اور'' کچھوے'' کے مجموعوں میں شامل کہانیوں میں اساطیری حوالے کہانی کی بنت میں پوری طرح پیوست ہونے سے یہ کہانیاں زمانی ومکانی قیود سے آزاد ہوکر ہر زمین، ہر زمانے اور ہر انسانی معاشرے کی کہانیاں بن جاتی لیکن اسطور سازی کے باوجود ان کہانیوں کا ایک مخصوص معاشرتی، ثقافتی اور زمینی سیاق و سباق بھی ہے جس نے ان کہانیوں کو اثر آفرینی بھی عطا کی اور فسانہ وفسوں کا رنگ بھی۔

اساطیر کی کثیر الابعادی جہات سے رشتہ قائم کرنے اور اسطوری امیجز سے فائدہ اٹھانے کی تخلیقی روش ۶۰ء کی دہائی کے اواخر میں واضح صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ جوگندر پال، انور عظیم، سریندر پرکاش، حسین الحق، شفق، رضوان احمد، حمید سہروردی، غیاث احمد گدی، انور سجاد، ممتاز مفتی، سلیم اختر، رشید امجد، غلام الثقلین نقوی، احمد داؤد، احمد ہمیش وغیرہ کے افسانوں میں اسطور سازی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

---

[1] کچھوے انتظار حسین ص ۱۷۱

☆۔ سال اشاعت ________ دسمبر ۲۰۱۳ء

☆۔ تعداد ________ ۵۰۰ (پانچ سو)

☆۔ کتابت و کمپیوٹر کمپوزنگ ____ شوکت احمد عباس

☆۔ سرورق ________ اختر رسول

☆۔ مطبع ---------------- کاف پرنٹرس خبہ کدل سرینگر

☆۔ قیمت ---------------- =/300 روپے

☆

ملنے کا پتہ

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی

حضرت بل سرینگر کشمیر۔۱۹۰۰۰٦

فیکس: 01942426513

BAZYAFT

(ISSN 0975-654X)

A Literary & Research Journal

Post-Graduate Department of Urdu

University of Kashmir, Srinagar-06

Fax: 01942426513 email:editorbazyaft@gmail.com

Website: http//urdu.uok.edu.in

Price: Rs. 300/=

بازیافت

تحقیقی و تنقیدی مجلّہ

2013ء

☆

ترتیب و تہذیب

منصور احمد منصور

☆

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل،
سرینگر کشمیر

2013
بازیافت
تحقیقی و تنقیدی مجلّہ
شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر کشمیر